تک احساس کمتری میں مبتلا اپنے ہونے کا جواز پیش کرتی رہے کب تک؟''

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، کیونکہ میرے پاس اسے دینے کے لئے کوئی جواب تھا ہی نہیں۔

ہم دونوں چپ چاپ چلنے لگے۔

''آپ مجھے ایک بلاک پیچھے تک چھوڑ آئیں گے چاچا جی۔ بارش سے پہلے جو ہوا چلتی ہے مجھے اس سے بڑا ڈر لگتا ہے۔''

''ضرور.....'' مجھے معاً وہ چھتری یاد آ گئی جو میں گھر بھول آیا تھا۔ میں بھی بارش میں بھیگنے سے بہت ڈرتا ہوں۔ لمبے زکام ..... دمیم کا اٹیک ..... کورٹیوزون ..... سانس کا اکھڑنا ..... لمبی پکڑ ..... پر کیا کرتا ہے ..... وہ ڈرتی جو تھی۔

''پتہ ہے چاچا جی! ان دنوں ہم چوبر جی کے پچھواڑے رہتے تھے۔ تب وہاں زیادہ آبادی نہیں تھی۔ ایک دوپہر کو کالی آندھی آئی ..... ہم گراؤنڈ میں کھیل رہے تھے میرا دوپٹہ ہوا میں اڑ گیا ..... میں اس کے پیچھے بھاگی۔ کچھ دیر تو دوپٹہ آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ پھر غائب ہو گیا۔ میں آندھی میں بھاگتی رہی پھر ایک درخت تلے بیٹھ رہی۔ کوئی گھنٹہ بھر آندھی کا زور رہا ..... میں بیٹھی رہی بیٹھی رہی چاچا جی، لیکن مجھے ڈر نہیں آیا ..... ایسا ڈر نہیں آیا جو اس ہوا سے آ رہا ہے .....''

آندھی میں دوپٹہ گنوا بیٹھنے والی لڑکی کے خوف کو سمجھنے کی کوشش میں ہم دونوں دوسرے بلاک میں پہنچ گئے۔

واپسی پر مہا بھارت یاد آ گئی۔ رانی دروپدی کے پانچھو ہر تھے اور جب جکش نے راجہ یدھشٹر کے بھائی مار ڈالے تو مہاراج ادھیراج کو بہت دکھ ہوا۔ بڑے جتن سے جکش کو پکڑا گیا۔ جب راجہ یدھشٹر کے سامنے جکس پیش ہوا تو راجہ نے کہا ''دیکھ جکش تو نے بلاوجہ میرے بھائی قتل کر ڈالے ..... رانی دروپدی کے سہاگ سے کھیلا کہ وہ بھی اس کی مانگ کا سیندور تھے۔

جکش بولا..... ''مہاراج یہ درست ہے کہ میں نے تیرے بھائی مار ڈالے اور دروپدی کا سہاگ اجاڑا، پر اس کی وہ وجہ نہیں جو تو سمجھتا ہے''۔

''پھر اصلی وجہ بیان کر.....''

جکش بولا..... ''اے مہاراج مجھے آج تک اپنے سوالوں کے جواب نہیں مل پائے۔ جب یہ سوال مجھے بے چین کرتی ہیں تو میں غصے میں بھوت بن جاتا ہوں..... نہ مجھے دھرم اچھا لگتا ہے نہ انتی..... نہ میں سیدھا مارگ سمجھتا ہوں نہ اندر رہنے کا بھید بھاؤ جو راستے میں آتا ہے مٹا ڈالتا ہوں۔''

''مجھ سے پوچھ جکش میں تجھے شانتی کا مارگ سمجھاؤں گا..... پھر تیرے دل سے راجہ بننے کی چنتا، محلوں میں جیون بسر کرنے کا لالچ اور استریوں کا لوبھ نکل جائے گا''۔

جکش نے ہنس کر کہا..... ''اچھا بتا پھر دھرتی سے وزنی کون؟''

یدھشٹر بولا..... ''ماں''۔

جکش نے وچھا اور ''آکاش سے اونچا؟''

''باپ۔''

''ہوا سے تیز رفتار؟'' جکش نے سوال کیا۔

''من۔''

''گھاس سے زیادہ پیدا ہونے والی چیز؟''

''فکر''

''اور پردیسی کا رفیق کون ہے'' جکش نے پوچھا۔

''سلوک'' یدھشٹر نے جواب دیا۔

''گرہستی کا دوست''۔

''عورت''۔

''اب تو پھنسے گا راجہ۔ یہ بتا اکیلا پھرنے والا کون''۔ جلکشن ہنسا۔

''سورج''

جلکشن چند لمحے چپ رہا پھر بولا...... ''اس دنیا میں بےفکری کیسے پراپت ہو''۔

''غصہ مارنے سے''۔

جلکش حیرانی سے گویا ہوا...... ''جسے دنیا کی ترقی درکار ہو اور نہ ملے، بتا اس کا دکھ کیسے ہرن ہو......''

یدھشٹر بولا...... ''لالچ اور محبت دور کر کے......''

جلکشن نے ابرو اٹھائے اور پوچھا...... ''یہ بتا وہ کونسا مرض ہے جو کبھی دور نہیں ہوتا''۔ یدھشٹر اس بار ہنسا ''دیکھ ادھرمی لالچ و حرص ایسا مرض ہے جو کبھی دل سے دور نہیں ہوتا۔ یہ چولا بدل بدل کر آتا ہے''۔

''کیا دھن دولت کے لئے اس دنیا کے لئے جتن کرنا چاہئے؟''

یدھشٹر نے کہا...... ''دیکھ اپرادھی آدمی صرف دھرم کے لئے جتن کرنے آیا ہے۔ جو دھرم کا پلڑا پکڑتے ہیں۔ دھرم ان کی حفاظت کرتا ہے۔ ورنہ نرک میں داخل ہونا آسان ہے۔ ہر بے دھیان کام کرودھ، لوبھ ہنکار کے راستے ہی تو نرک میں قدم رکھتا ہے......''

جلکش نے سر جھکا کر کہا...... ''مہاراج تجھے اختیار ہے جو چاہے میرے ساتھ کر۔ میں اپنا آپ تیرے قدموں میں ارپن کرتا ہوں......''

جلکش کے سوال حل ہوئے، لیکن میرے اندر ترقی اور فلاح کی قینچی سے سب کچھ کٹتا رہا۔

بیلکونی ٹائم میں پلاسٹک کی کرسی سے پشت لگا کر میں نے سوچا...... شاید روبینہ کی بات درست ہے۔ ہر اقلیت خوفزدہ رہتی ہے۔ وہ مکمل طور پر اپنی شناخت بھی گنوانا نہیں چاہتی۔ اسی لئے مور پنکھ لگا کر اکثریت میں ضم ہونا بھی اس کے لئے ممکن نہیں۔

یہی دوہری خواہش اس کے خوف کو گھمبیر بنا دیتی ہے، لیکن کبھی کبھی معاملہ اس سے الٹ بھی ہو جاتا ہے۔ کمزور اکثریت کو طاقتور اقلیت سے پالا پڑ جاتا ہے، برصغیر میں مسلمانوں کو اپنی شناخت قائم رکھنے کے لئے کئی بار مختلف قسم کے امتحانوں سے گزرنا پڑا۔ پارسی اقلیت معاشرتی طور پر اکثریت میں ضم نہیں ہوئی۔ جنگ آزادی کے بعد انگریز گو اکثریت میں نہیں تھے، لیکن حاکم ہونے کے باعث اس اقلیت کا سٹیٹس، رسم ورواج، تعلیم سب قابل تقلید ہے..... ہندو نے بہت جلد اس حقیقت کو بھانپ لیا کہ انگریز کی بالادستی کو قبول کئے بغیر کوئی نفع کا سودا نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں کو عجب مخمصے کا سامنا تھا۔ انہیں یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ وہ ترقی کے حق میں ووٹ دیں یا فلاح کا راستہ اختیار کریں۔ سرسید نے نئے تقاضوں کے پیش نظر علی گڑھ کالج کی شکل میں فلاح کے بجائے حصول ترقی کو ترجیح دی۔ حالی نے بڑھتے ہوئے مدوجزر کے نتائج سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ابن الوقت کا نقشہ کھینچ کر اس حالت سے ڈرانے کی کوشش کی جو اندھا دھند تقلید کے باعث فلاح کے راستے سے ہٹا دیتی ہے۔ اقبال نے بھی سائرن بجائے۔ جنگ آزادی کے وقت انگریز جو اقلیت میں موجود تھا، وہی قیام پاکستان کے بعد ناموجود ہو کر بھی فعال رہا اور بڑے شہروں میں مسلمانوں کی شناخت مغربی ہوتی چلی گئی۔ بریلوی اور دیوبندی دونوں تحریکیں اسی جداگانہ اسلامی شناخت کو قائم کرنے کی آرزومند تھیں۔ بریلوی چاہتے تھے کہ رحمتوں پر تکیہ کر کے کشتی بیچ منجدھار چھوڑ دی جائے۔ دیوبندی تحریک مسلمانوں میں مضبوطی اور خود انحصاری کو شعار بنانا چاہتی تھی۔ اس اختلاف کے باوجود خواہش دونوں کی ایک ہی تھی کہ مسلمانوں کی شناخت قائم رہے اور وہ فلاح پائیں۔ لیکن تعجب ہے قیام پاکستان کے بعد جو اقلیت امریکہ میں وارد ہوئی، اس کا مسئلہ سنگین تر تھا۔ امریکہ سڑکوں، بازاروں اور اشیاء کا معجزہ ہے۔ یہاں قدم قدم پر حیرت کا بازار گرم ہے۔ عام انسان کے لئے یہ فراوانی کا خواب ہے۔ امریکہ حیرت کے دریا کا وہ ساحل ہے جہاں

کھڑے ہوکر پہلی بار انسان اپنے اندر تبدیلی محسوس کرتا ہے اور اس کی اپنی شناخت متزلزل ہوتی ہے۔ جس قدر کوئی حیران، انگشت بدنداں ہوگا، اتنی ہی اس میں تبدیلی آئے گی۔ محیر العقول اشیاء کی سرعت سے بھرتی منڈی آپ کو دنگ کرتی ہے۔ بازار آپ کو گم کئے دیتے ہیں۔ ان کی سیر گویا ہر شہری کا جنت میں مفت داخلہ ہے۔ پھر یہاں کے نظام دنگ کرتے ہیں..... آہستہ آہستہ اکثریت گھیرے میں لے لیتی ہے اور نو وارد حیرت زدہ پر رنگ چڑھنے لگتا ہے۔ کمزور اقلیت کے پاس دکھانے سنانے، ابھارنے اور منوانے کے لئے کوئی چیز نہ ہو تو وہ اکثریت کے بہاؤ میں ایسے ہی بہنے لگتی ہے جیسے دریا کے ریتلے ساحل۔

سب سے پہلے اقلیتی ابن الوقت کا لباس بدلتا ہے۔ عموماً یہ تبدیلی سردیوں میں شروع ہوتی ہے۔ مرد تو خیر جنگ آزادی کے بعد سے پینٹ قمیض کے رسیا رہے لیکن نو وارد عورتیں یہ کہہ کر جینز پہننے لگتی ہیں کہ سردیوں میں ایک تو سردی سے بچاؤ بہتر ہوتا ہے اور دوسرے کام کاج میں یہ لباس زیادہ کمفرٹیبل اور پھرتیلا بنا دیا ہے۔ جواز جو بھی دیا جائے اپنے عمل کو مضبوطی عطا کرنے کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ شروع میں جینز کے ساتھ لمبے بازو کی قمیض سویٹر یا ونڈ بریکر استعمال میں آتا ہے۔ آہستہ آہستہ گرمیوں تک لباس وہی ٹھہرتا ہے جو مروج ہو بغیر آستین کی بنیان دیکھ کر نہ اچنبھا ہوتا ہے نہ افسوس..... امریک مقیم اقلیتی عورت ماڈرن لگنے ہی میں اپنے آپ کو اکثریت کا حصہ سمجھنے لگتی ہے۔

دوسری چیز جو اقلیت میں ذرا بعد میں بدلتی ہے، وہ نو وارد کی زبان ہے اور زیادہ اہم ہے۔ کچھ لوگ بہت جلد امریکی لہجے کو اختیار کر لیتے ہیں۔ ذہن سے زیادہ ایسے لوگوں کی قوت سماعت تیز ہوتی ہے، وہ Slang سے خوب آگاہی پیدا کرتے ہیں۔ گو زبان نہیں آتی، لیکن لب ولہجہ کے زور پر پٹرول پمپ پر کام کرنے والا، ٹیکسی ڈرائیور، ڈکیئر میں بچوں کی دیکھ بھال کرنیوالیاں، دوکان کی سیلز گرل، غرضیکہ جہاں بھی کام

میں لوگوں سے تال میل زیادہ ہو، سب زبان کے اتار چڑھاؤ اور لب و لہجہ کی باریکیوں کو سمجھ جاتے ہیں۔ رے کو کیسے رول کر کے ادا کرنا ہے اور لا کی آواز نکالتے وقت منہ کو کیسے گول کیا جاتا ہے یہ کچھ زیادہ وقت طلب مراحل نہیں ہوتے، جس طورح عورتیں میک اپ استعمال کرتی ہیں۔ ایسے ہی اقلیتی زبان کے لہجے میں اپنی کم علمی کو چھپالیتا ہے۔ دوسرے ممالک سے آئے ہوئے تارکین کی مشکلات دیکھ کر امریکن سکولوں میں اب اے بی سی پر زور نہیں دیا جاتا، بلکہ آوازوں کی شناخت سے حروف سکھائے جاتے ہیں۔ اس طرح بول چال تو جلد درست ہوتی ہے، لیکن زبان کے رموز ہمیشہ وقت طلب ہوا کرتے ہیں اور لسانی مہارت ایک مدت کے بعد حاصل ہوتی ہے اسی لئے اقلیت میں زبان دان کم پیدا کرتے ہیں۔

یوں لباس اور زبان کے مور پنکھ لگا کر کوا ہنس چال کے قابل ہو جاتا ہے، لیکن اس یافت کے ساتھ ساتھ اقلیت کو بہت سی اپنی چیزیں چھوڑنے کا احساس بھی گھیر لیتا ہے۔ Exposure کے ایسے فائدے عموماً مالی شکل میں لوٹتے ہیں۔ پھر آزادی کا فروغی احساس بھی ہوتا رہتا ہے، لیکن اس ترمیم اور اضافے کے باوجود اقلیتی افراد کو ایک طرف تنہائی دوسری جانب احساس جرم کاٹتا رہتا ہے۔ اپنے لباس اور زبان سے بے وفائی کی مشکل اسے اندر ہی اندر پژمردہ رکھتی ہیں۔ تنبولی سے پان لے کر کھانے سے ہونٹ تو سرخا سرخ رہتے ہیں، لیکن اندر تارکین کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لالی اصلی نہیں۔

ہولے ہولے زبان اور لباس سے فارغ ہو کر اس نئے سورج سنسار کی روشنی میں اقلیت کو اپنے منیں کئی طرح کی کمی نظر آنے لگتی ہے، وہ مکمل طور پر اپنا رنگ تو بدل نہیں پاتا، لیکن عورتیں کالے سانولے گندمی رنگ کے خلاف خوب جہاد کرتی ہیں۔ خاص طور پر بال اور رنگ بلیچ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتیں۔

امریکہ میں شکل کو مغربی معیار پر ڈھالنے کے لئے بال اور رنگ بدلنے کے لئے

کریم، لوشن، ہیر ڈائی کی پوری انڈسٹری اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ خوبصورتی میں کمتر ہونے کا احساس کمتری اندر سے گھونسے مارتا رہتا ہے، لیکن اقلیت ہار نہیں مانتی۔ جب رنگ، لباس اور زبان کی تبدیلی کافی نہیں پڑتی اور کو محسوس کرتا ہے کہ مور پنکھ پھیکے پڑ رہے ہیں تو رفتہ رفتہ وہ اپنی اقدار اور مذہب کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ جہاں پہلے نبیوں کے بتائے ہوئے فلاح کے گر زندگی کے فیصلوں پر حاوی تھے۔ وہاں اب ہیومن رائیٹرز کا خیال رہتا ہے۔ اکثریت میں گم ہونے کی خواہش ہر قسم کی رکاوٹ کو ختم کرتی ہے۔ پچھلی قدریں چھوڑ کر صرف کام کی اخلاقیات باقی رہ جاتی ہیں۔ اقلیتی فرد صرف کام کے سہارے زندہ رہنے کا فن سیکھ لیتا ہے۔ کام کے سامنے ہر قدر ماند پڑ جاتی ہے۔ اصلی قدریں جعلی دستاویزیں نظر آتی ہیں۔ رشتے ناطے بھوسی بن جاتے ہیں۔ بوڑھے بڈھا ہاؤس میں اور بچے بے بی کیئر میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں لاکر اقلیتی افراد سمجھتے ہیں کہ اب وہ اکثریتی دیگ کا حصہ بن گئے ہیں۔

لیکن اتنا سب کچھ بدلنے، چھوڑنے بے تال ہو جانے پر بھی نیگرو، پاکستانی، سری لنکن، جاپانی، چینی، سب دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ خود اقلیت کو اشتباہ نظر کا دھوکا ہوتا ہے کہ وہ اکثریت میں بدل گئے ہیں، کسی سفید فام امریکی کو یہ شبہ ہرگز نہیں ہوتا۔ وہ تو اس قدر جداگانہ نسلی امتیاز کا شعور رکھتے ہیں کہ ترکوں کو یورپ کا حصہ بننے نہیں دیتے۔ اپنے آپ کو ایرانی، ترک یا لبنانی سمجھنے والا پاکستانی یہ سمجھ نہیں پاتا کہ یہ اعزاز امریکی کے نزدیک کچھ ایسے فخر کی بات بھی نہیں اور جن سے ہم براؤن لوگ اپنی شناخت مستعار لے رہے ہیں ان کی چولیں بھی اکثریت میں فٹ نہیں ہوسکیں۔ ان کے لئے بھی کسی امریکی کے دل میں نرم کونا نہیں۔

جب اکثریت کا بہاؤ تیز ہو تو اقلیت کے خس و خاشاک اس میں تیزی سے بہتے ہیں، لیکن جب دریا سست رفتار ہو کر میدانی علاقے میں سستی سے چلنے لگے تو پھر درختوں سے گرے ہوئے تنے، ٹوٹے پل، شہروں سے آنے والا کوڑا کرکٹ پانی کے

بہاؤ کو روکنے لگتا ہے۔ امریکہ کے آزادی پسند لوگوں نے جب ریڈ انڈین قالیت کو جنگلوں میں بھگا دیا تو کچھ دیر کے بعد ان کو بھی احساس جرم نے ستایا۔ ان کے خدا ترس لوگوں نیسوچا کہ یوں تو ساری دنیا میں ظلم ہم سے منسوب ہو جائے گا۔ امریکی پر سونا کو دھچکا لگے گا۔ اقلیت کو برابری کا احساس دلانا، اس کی حفاظت کرنا، اس کے کلچر اور مذہب کو اہمیت دینا جمہوری حکومت کی نیک نامی کے لئے ضروری تھا۔ اس طرح ریڈ انڈین Reserves میں دھکیلے گئے۔ اسلامک سنٹر، صوفی تحریکیں، ہندو پنتھ، چی، تاؤ، کنفیوشس کی تعریف پر اکثریت کا ایک حصہ زور و شور سے مامور ہو گیا۔ ہیومن رائٹرز کو بروئے کار لا کر اکثریت اپنے آپ کو لبرل، انسانیت پسند، بھدر پرش پیش کرنے میں سہولت محسوس کرنے لگی۔ ادھر اس رویے سے اقلیت کا خیال ابھرا کہ وہ اکثریت میں ضم ہو رہی ہے، لیکن اکثریت اس بات کا خیال رکھتی ہے کہ کسی طور بھی اقلیت کو سیاسی طاقت حاصل نہ ہو اور وہ بڑے دھارے کا حصہ نہ بنے۔

شری رجنیش نے جب اپنی سیاسی اہمیت جتانا شروع کی، انہیں منہ کی کھانا پڑی۔ امریکی سیاسی ناپنے جانتے ہیں کہ اگر کتے کو زنجیر سے باندھا جائے تو وہ زہری ہو جاتا ہے۔ پچکار کر لے پالک بنا کر رکھا جائے، اس کی ٹریننگ پر وقت صرف کیا جائے تو وہ گھر کی رکھوالی کرتا ہے۔ اخبار لانے، ڈاک پکڑانے، اجنبی کی اطلاع دینے اور سلنک بھگانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اکثریت بھی اس ٹریننگ پر لگتی رہتی ہے۔ ایک سے قانونی حقوق لے چکنے کے بعد اپنی شناخت گنوا بیٹھنے کے بعد بھی یہ حقیقت نہیں بدلتی کہ اقلیت بھی اکثریت کا حصہ نہیں بن پاتی۔ وہ اکثریتی دریا پر خس وخاشاک کی طرح بہتی ہے۔ نیگرو بہر حال نیگرو رہتا ہے۔ جاپانی، ترکی، چینی، پاکستانی بہر کیف اپنے آپ کو نئے ماحول میں مانوس اجنبی سمجھتے رہتے ہیں۔

جس طرح ایک کالی لڑکی، چھوٹے قد کے مرد، موٹے آدمی، گنجے کو ایک گہرا احساس کمتری رہتا ہے، ایسے ہی اقلیت کبھی بھی کمتر ہونے کے جذبات سے بچ نہیں

سکتی ۔اس کے اپنے چاہنے والے ساری عمر اس کی کمی کا ذکر برملا نہیں کرتے، لیکن دوسرے لوگوں کی زبانیں روکی نہیں جا سکتیں۔ وہ موٹو، گٹھو، کلو جیسے نام بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔اب Complexed انسان کے لئے تین راستے ابھرتے ہیں ..... یا تو وہ اس جسمانی کمزوری کا بھرپور دنیاوی علاج کرے۔ جو بھی بشری تقاضا ہو، اسے اپنی بقاء کا راستہ بنائے یا پھر روحانی علاج کی طرف رجوع کرے اور کسی معجزے کے انتظار میں رہے۔اگر یہ دونوں چیلنج اس کی ہمت سے زیادہ ہیں تو پھر اپنی کمتری کو مان کر برا ماننے اور رنجیدہ ہونے کی سٹیج سے نکل جائے اور معاشرے میں پچھلی بنچ پر بیٹھنے کی عادت ڈال لے اور اپنے آپ کو اصلی شہری کے بجائے دو نمبر کا انسان سمجھلے ۔جتنی کریمیں، گنج کے علاج اور ورزشوں کے سنٹر انسانوں کی آرزوؤں کے باعث لکرمتوں کی طرح مارکیٹوں میں آئے ہیں۔جن سے کروڑوں کا کاروبار چل رہا ہے، احساس کمتری میں مبتلا ان لوگوں کی جیبیں خالی کرنے کے ذرائع ہیں

.....

جوں جوں انسان اپنی کمی کو زیادہ محسوس کرتا ہے، اس کا رجوع دولت کی طرف تیزی سے ہوتا ہے۔دولت وہ زبردست مورپنکھ ہیں جس سے بیچارہ کوا ہنس بننے کے آخری خواب دیکھتا ہے .....فرد کی حد تک تو دولت کا نسخہ کافی کامیاب رہتا ہے۔کار، بنک بیلنس، کوٹھی، ہوائی سفر، دبدبہ، فرعونیت اور ہم چوں ما دیگرے نیست والا Illusion قائم رہتا ہے، لیکن عموماً دولت اقلیت کا مسئلہ مجموعی طور پر حل نہیں کر سکتی ۔جب اقلیت ضم ہونے کی تمام تر اکیب استعمال کر چکتی ہے اور کامیاب نہیں ہو پاتی۔ جب چینی پانی میں اور زیادہ حل نہیں ہو سکتی تو ایک بار پھر محلول سوکھنے لگتا ہے۔چینی علیحدہ ہو کر Crystals کی شکل اختیار کرنے پر مجبور ہے۔

اس وقت اقلیت مایوسی کا شکار ہو کر مراجعت کرتی ہے۔اپنے مذہب، کلچر، زبان، لباس کی طرف۔

واپسی کا سفر..... لیکن اس پچھل لوٹنے کا ذکر میں پھر کروں گا۔ میری بیٹی گھر میں ہے اور مجھے کھانے کے لئے آوازیں دے رہی ہے۔ اس کی آواز میں سائرن بجنے کی کیفیت ہوتی ہے۔ ارجمند سر سے پاؤں تک Workaholic ہے۔ وہ چلتے پھرتے کھانا کھاتی ہے۔ بیٹھ کر ٹی وی نہیں دیکھ سکتی۔ واک مین لگا کر کپڑے استری کرتی ہے۔ کتاب پڑھتے وقت بھی کمپیوٹر لگائے رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک سب سے قیمتی چیز وقت ہے۔ وہ ہر لمحے اسے سونے میں تبدیل کرتی رہتی ہے۔ کبھی وہ وقت کو گھر کے کام میں بھناتی ہے۔ کبھی اپنے جسم کی ورزش میں بدل دیتی ہے..... اس کی سب سے بڑی تفریح یہ ہے کہ وہ مصروف رہے اور کام کی زیادتی کے خلاف ہر ایک سے گلہ بھی کرتی رہے۔

یہی پھوکٹ، کھوکھلا، بھوسی بنا وقت امریکہ کا اصلی ویسٹ ہے۔ جنک یارڈز میں جو کچھ اکٹھا ہوتا رہتا ہے وہ تو Recycle کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وقت کے بھرکس سے کچھ نہیں بنتا۔ انسان خالی الذہن ہو کر ہوا میں گھورنا، ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کا فن بھول گیا ہے Meditation کے سنٹر تو ہیں، لیکن وہاں بھی گیان دھیان کو کام میں بدل کر مصروف رہنا اصل مقصد ہے۔ کاموں سے بے پرواہ، تعلقات سے بے نیاز، ندی کنارے بیٹھ کر دریا کے بہاؤ کو دیکھتے رہنے کا فن اب شہری لوگوں کو بھولتا جا رہا ہے۔ جب امریکی بریک کے لئے گھر سے نکلتا ہے تو اسے بہت سے انتظامات کرنے ہوتے ہیں۔ مچھلی پکڑنے کا سامان، سٹیل اور مووی کیمرے، کتابیں، سلیپنگ بیگز حتیٰ کہ کچھ لوگ تو باربی کیو کی انگوٹھی اور Marinate کیا ہوا گوشت مرغی بھی ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ہالی ڈے بذات خود کام میں بدل جاتی ہے۔ کھیتوں کو فارغ چھوڑے رکھنے سے شعاعیں مٹی میں داخل ہوتی ہیں اور ہوا میں سے گرنے جھڑنے والا پولن بڑی روئیدگی لئے کھیتوں میں جاری ساری رہتا ہے۔ انسان جب کام کاج چھوڑ کر ٹانگیں پھیلائے، سر کے پیچھے ہاتھوں کی کنگھی سے سہارا دے کر مندی مندی

آنکھوں سے نیلگوں آسمان کو دیکھتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کے شعور اور لاشعور کا درمیانی دروازہ کھلتا ہے۔ پھر وجدان کی پریاں اشارہ پا کے اسے تحت الشعور کی دنیا میں لے جاتی ہیں۔ تخلیق کے پرندے پھڑ پھڑاتے ہیں صدیوں کی گم گشتہ آرچی ٹائپ شبی ہیں ملتی ہیں۔ ماضی اور مستقبل کے اسرار و رموز سے شناسائی ہوتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو Hyonotise کرنے کی قوت سے شناسا ہو جاتا ہے۔ تحت الشعور ہی یادوں کا سٹور ہاؤس ہے۔ ان سلجھی گتھیوں کا پنڈورا باکس ہے۔ یہیں سے عرفان ذات کا علم ملتا ہے۔ مصروف انسان کی یہاں تک رسائی نہیں ہو پاتی۔

میں آپ سے اقلیت کی بے چارگی کے بارے میں بات کر رہا تھا، لیکن فرد کی گمشدگی کی طرف کھسکتا چلا گیا..... ترقی کے لشکارے تو حیرت میں ڈبوتے گئے لیکن فلاح کا دروازہ بند ہوتا چلا گیا۔

''ابو.....'' بیلکونی میں ارجمند کی آواز پھر آتی ہے۔

''آجائیے مجھے ہسپتال جانا ہے..... دیر ہو رہی ہے ابو۔''

میں خیالوں کے الجھے دھاگوں کا لچھا پلاسٹک کی کرسی پر رکھتا ہوں۔ سامنے والے گھر کی بیلکونی سے گریک بڈھا چابیوں کا گچھا نیچے سڑک پر پھینکتا ہے۔ اس کا جوان سال بیٹا ان چابیوں کو دونوں ہاتھوں میں کیچ کرتا ہے۔ جب بڈھے نے چابیوں کو نیچے گرایا تو میں نے دعا کی تھی کہ یہ چابیاں سیدھی نوجوان کے ہاتھوں میں پہنچیں، سڑک پر نہ گریں..... مجھے وہم تھا کہ اگر چابیاں نیچے گر گئیں تو گریک نوجوان کے لئے اچھا نہ ہوگا، وہ اتنے بڑے بڑے ٹرک چلاتا ہے جن میں کاریں سامان سفر ہوتی ہیں۔ ایسے ٹرک ڈرائیور کی زندگی کے لئے مجھ جیسے بڈھے کو خوف آتا ہے۔ میں اس کے لئے صرف دعا کر کے شگون کا سہارا لے سکتا ہوں۔

ہم بڈھے لوگ حزن و ملال کے بندے ہوا کرتے ہیں۔

خوف ہمارا گائیڈ ہے..... ہم جیسے عمر رسیدہ یہاں کے دوزخ سے نکل کر مابعد کے

جہنم میں داخل ہو جائیں گے۔اس تسلسل کی وجہ سے ہمیں علم بھی نہ ہو گا کہ یہ کارنامہ کیسے ہوا۔شاید اسی خوف کی وجہ سے ہم مضبوط فیصلوں کے سہارے نہیں جیتے۔ہم شگونوں کی انگلی پکڑ کر فیصلے کرتے ہیں۔ہمیں ہر وقت استخارے کی ضرورت رہتی ہے۔ ہم اخباروں میں دیکھتے ہیں آج کا دن کیسا گزرے گا؟ جنم کنڈلی ہماری بنیادی کھوج ہے۔نجومی، عامل، پیر فقیر، تعویذ گنڈا، وظیفے وظائف ہماری اصلی زندگی ہے۔ہم بشری تقاضوں کو پورا نہیں کر پاتے اور مذہب کی اساس جو صبر و شکر ہے، اس کو بھی مان نہیں سکتے۔کیونکہ صبر کسی شگون کا سہارا نہیں لیتا۔ہم کہیں خواب و خواہش کے درمیان، اصل و نقل کے مابین، حقیقت اور خواب سے ملا جلا ایک ملغوبہ تیار کرتے ہیں اور اسی معجون مرکب کو چاٹ چاٹ لاحاصل زندگی بسر کرتے ہیں۔

آواز پھر آتی ہے..... ''ابو جی آجائیں پلیز.....''

''آرہا ہوں، آرہا ہوں۔آگیا بس۔''

ایک بار میں نے گھر کے آگے ڈھیر اخبار رسالوں میں سے ایک ٹیبلو نکالا۔اس میں وڈرج تھا۔اینجلا گیارہ برس کی تھی، لیکن ایک لمبی بیماری کے دوران اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔والدین نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، لیکن اینجلا چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوئی۔ہار کر اسے سان فرانسسکو کے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔

اینجلا میں ایک خوبی تھی۔وہ معذوری کے باوجود پرامید رہا کرتی۔کوئی لمحہ ایسا نہ آتا جب وہ اپنے اللہ سے مایوس ہوئی ہو۔جب کبھی کوئی نرس یا ڈاکٹر اس سے تسلی آمیز بات کرتا تو وہ کہتی..... آپ کیوں مایوس ہوتے ہیں، مجھے اشارہ آچکا ہے۔میں چلوں گی اور سکول میں پڑھوں گی۔''

ایک رات اچانک اس کا پلنگ چلنے لگا۔وہ چلائی دیکھو دیکھو معجزہ ہو گیا۔میں چل سکتی ہوں..... فوراً اس نے پلنگ سے چھلانگ لگائی اور چلنے لگی..... اینجلا سکول جانے لگی اور کھیلوں میں حصہ لینے کے قابل ہو گئی..... کچھ لوگ کہتے ہیں، اس کی شدید

آرزو نے یہ معجزہ کیا..... کچھ دین داروں کا خیال تھا کہ اسے تو پہلے سے اشارہ آچکا تھا۔اسی شگون نے اس کا ایمان مضبوط کیا اور وہ معجزے کے قابل ہوئی۔

کچھ تحقیقی لوگوں نے اظہار کیا۔ پلنگ کا چلنا معجزہ نہ تھا۔اس رات سان فرانسسکو میں زلزلہ آیا۔اسی ہسپتال میں ایک پورا بلاک گر گیا۔یہ اب انسان کی استعداد یا مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اینجلا کے چلنے کو زلزلے سے منسوب کرے یا معجزے سے۔وہ شگون کی راہ چلے یا حقیقت کی لاٹھی ہنکائے۔خیال اور حقیقت یہ متضاد راستے دونوں سچے ہیں۔صرف فیصلہ آپ کا اپنا ہے..... کبھی کبھی ایک پٹڑی سے اتر کر دوسری پر چل نکلنا بھی اتفاقاً اور اتفاقیہ ہوتا ہے..... مشکل یہ ہے کہ بوڑھا آدمی جدھر بھی چل نکلے، وسوسے اس کی جان نہیں چھوڑتے۔خوف اس کا مستقل ساتھی ہے۔

شام کمو پھر میں بیلکونی میں بیٹھ کر ارجمند کا انتظار کرتا ہوں۔لاہور میں میری بہت سی مشکلات تھیں جن کا تعلق پیسے سے نہیں، فعال ہونے سے تھا۔بجلی کا بل، ٹیلی فون کی ادائیگی، اپنی ڈاک خود پوسٹ کرنے جانا پڑتا تھا۔عموماً کسی پلمبر، الیکٹریشن، گٹر کھولنے والے کے ساتھ مغز پچی کا مرحلہ پیش آتا۔بڑے گھر کا میک اپ بڑی فعالیت چاہتا اور اب مجھ میں نگرانی کرنے والے کام کروانیکی ہمت نہ تھی۔یہاں مجھے کوئی اہم کام نہیں ہے، بلکہ یوں سمجھئے کہ اپنے لئے مائیکرا وون میں کھانا گرم کرنے کے سوائے مجھ پر کوئی بھاری ڈیوٹی نہیں۔راحتیں قریب قریب مکمل ہیں، لیکن اب دن بہت لمبا ہو گیا ہے۔لاہور میں نظریاتی اختلافات کے ہاتھوں دوستوں میں بول چال بند ہو جایا کرتی تھی۔لیگ اور پیپلز پارٹی نے خاندانوں کو دو پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ڈرائنگ روم کی فضائیں ورلڈ ڈائیریا کے ہاتھوں بدبودار تھیں۔قیمتیں فلک بوس ہو رہی تھیں۔ڈالر کی قیمت بڑھ جانے کے باعث کئی گھروں میں مالی استحکام ناممکن تھا اور لوگ ان مشکلوں کے ہاتھوں حیرت زدہ مرنے مارنے کی سوچ رہے تھے۔لیکن ..... ان ہی مشکلات کے ہاتھوں اکثریت زندہ بھی تھی۔بوریت کا وقت نہ تھا۔سوچنے

اور تفکر کرنے کی مہلت نہ تھی۔ ارجمند کے صاف ستھرے گھر میں مجھے بار بار گھڑی دیکھ کر مایوس لوٹنا پڑتا منٹ سالوں میں کٹتا۔ مشکلات میں گھرا انسان تیز سوچتا اور تیز ترین دوڑتا ہے۔ اس کے لئے وقت ہمیشہ کم اور وسائل کم تر ہوتے ہیں۔ وہ جدوجہد کی سان پر چڑھا رہتا ہے، لیکن اس کا وجود اسے تنگ نہیں کرتا۔ جونہی وافر وقت حاضر مال بن کر آجائے، اپنے وجود کے ساتھ وقت گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر نفسیاتی بیماریاں تنہائی کی بے معنویت ستانے لگتی ہے۔ عرفان ذات حاصل کئے بغیر اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ ذکر کے بغیر کسی طور بھی انسان مجتمع نہیں ہو پاتا۔ کیا کیا جائے اطمینان نہ وہاں تھا نہ یہاں، ایک اس کی ذات سے بندھے رہنے میں فلاح کی پھوار پڑتی رہتی تھی۔

پلاسٹک کی کرسی کو میں نے دسویں مرتبہ ٹشو سے صاف کیا۔ کرسی پر کہیں ایک ذرہ بھر مٹی نہ تھی، لیکن میرے پاس وقت ہی وقت تھا اور میں ہر بوڑھے آدمی کی طرح تذبذب کے ہاتھوں اس یک درست مصرف سے نا آشنا تھا۔ مجھے خالی سیڑھیوں پر چل کر تحت الشعور تک پہنچنا نہ آتا تھا۔ نہ ہی مابعد تک کوئی ہوائی جہاز جاتا تھا۔

مشکل یہ ہے کہ انسان اپنے ماضی سے بہت کم سیکھتا ہے۔ تجربہ انسان کا بدترین استاد ہے۔ یہ علم عطا کرنے سے بہت پہلے ہاتھ میں امتحانی پرچہ پکڑا دیتا ہے۔ کمال اتاترک نے اپنے تجربات سے سیکھنا اور سکھانا چاہا۔ وہ اپنے لئے اور اپنی قوم کے لئے فلاح کی تلاش میں تھا۔ اس نے وی ٹوپی اتاری اور ہیٹ کو اپنایا۔ ترکی زبان کا رسم الخط بدل کر زبان کو رومن تحریر کے تابع کیا۔ مولوی کو معاشرے کا ویلن سمجھ کر اسے قرار واقعی سزا دی اور مذہب میں بشرط استواری کو ایمان کی کمزوری جانا۔ عورتوں کو آزادی کی راہ سجھا کر منزل کا سراغ نہ دیا۔ تجربے پر تجربہ کیا، امتحان سے پہلے گزرا اور نتائج بعد ازاں نکلے۔

افسوس اتاترک کے سوچ کے وہ نتائج نہ نکلے جن کی اتاترک کو امید تھی۔ تجربہ نئی

سمت میں ضرور لے گیا۔ تبدیلی کا حامل بھی تھا۔ پر کہیں خواب دیکھنے والے کمال اتاترک نے ادھورا تجربہ کیا اور پختہ خواب دیکھے، اسی لئے آج تک ترکی یورپ کا حصہ نہ بن سکا۔ وہ یورو کے لئے ترس رہا ہے اور یورپ پرے پرے کہتا نظر آتا ہے۔ اکثریت میں مدغم ہونے کی خواہش اتنی شدید ہے کہ ابھی تک ترکی اپنی راہ متعین نہیں کر پایا۔ ایشیا کا حصہ وہ کہلانا نہیں چاہتا اور یورپ اسے اپنانا نہیں چاہتا۔

دوسرا تجربہ ایران کے شہنشاہ نے کیا۔ اس نے ہر طور مغربی کلچر میں ضم ہونے کی کوشش کی۔ جوں جوں تیل کی فراوانی کے ہاتھوں ایرانی خوشحال ہوئے، ویسے ہی وہ شناخت کے طور پر پامال بھی ہو گئے۔ پھر امام خمینی نے ایرانی لوگوں کے بکھرے تسبیح دانوں کو ایک دھاگے میں پرونے کی کوشش کی۔ یہ تجربہ بھی دو ہزار نیئے کے قریب آ کر دم توڑتا نظر آتا ہے۔ ایک تجربہ اسپین میں بھی ہوا تھا۔ طارق بن زیاد کشتیاں جلا کر اسپین پہنچا۔ نو سو سال حکومت کرنے کے بعد اپنے گھروں کی چابیاں لے کر خالی ہاتھ فاتح لوٹ گئے۔ کچھ امریکہ سدھارے، باقی وطن لوٹ گئے۔ سپین کی اکثریت نے اس مضبوط اقلیت کے مذہب کو نہ اپنایا۔ شاید یہ رنگ کا کرشمہ ہے کہ سفید فام قومیں سیاہ لوگوں کا مسلک نہیں اپنا سکتیں یا پھر اسپین کے لوگ عیسائیت میں اس قدر راسخ العقیدہ تھے کہ انہوں نے سیاہ فام لوگوں کے عقید کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ ایسے ہی ذلتیں سہتے ''رفیق رفیق'' کی صداؤں پر بھاگتے جب پاکستانی لوگوں کا سعودی عرب میں دم پھولنے لگتا ہے تو وہ سوچنے لگتے ہیں کیا وطن لوٹ جائیں اور ناداری، مفلسی اور بے راحتی کی زندگی اپنائیں یا پھر مور پنکھ اتار کر دھڑے سے کوے کی زندگی بسر کریں، جسے نہتو پردیس میں پوری توقیر ملتی ہے نہ اپنوں میں اپنایت کا احساس ہوتا ہے۔ امریکہ میں احساس تنہائی سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوتا۔ اکثریت میں مدغم ہونے کی خوشی اور خواہش اور اپنی شناخت قائم کرنے اور رکھنے کی آرزو مسلسل رسہ کشی کی صورت اختیار کئے رکھتی ہے۔ جب اقلیت کے مور پنکھ کافی نہیں ہوتے تو ایسے بھی کلاس سٹیزن

جنہیں ہیومن رائٹرز تو ملتے ہیں، لیکن وہ مساوات نہیں ملتی جو صرف نبیوں کی میراث ہے۔ ایسے میں اقلیت کبھی کبھی اقلیتی گروہوں کی شکل میں بٹ جاتی ہے۔ ایسے گروہ اپنے مذہب اور کلچرل کی پاسبانی کے لئے اٹھتے ہیں۔ عورتوں کے سروں پر حجاب آجاتے ہیں۔ مرد مسجدوں میں نماز ادا کرنے لگتے ہیں۔ گھروں میں میلاد، مجلسیں، روزہ کھلائی کی محفلیں، آمین اور شادی کی رسومات وطن کی طرف لوٹ جانے کا خواب ہوتی ہے۔ ڈرگز، جنسی بے راہ روی، آزادی سے حاصل کردہ جرائم سے خوفزدہ ہو کر مسلمان تارکین ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے سفید لوگ انہیں فنڈ امنٹلسٹ کہتے ہیں۔ اکثریت اس انداز زیست سے خوفزدہ ہو کر ایسے مسلمان گروہوں کو دہشت گرد گردانتی ہے۔ دریا کے ساتھ ساتھ بڑے بہاؤ پر بہنے والے خس وخاشاک یکدم زہریلے بریئے نظر آنے لگتے ہیں اور اکثریت یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ یہ اقلیتی گروہ نا احسان فراموش لوگ ہیں جنہیں پناہ، راحت، آرام ملا اور اس کے بدلے انہوں نے اپنی شناخت کی ڈھال پہن کی۔

اقلیت کا اکثریت میں ڈھلنے کی کوشش اور پھر اپنی جداگانہ شناخت کے لئے کوشاں ہو جانا۔ بہر کیف یہ قوموں کے پنڈیولم کا سفر ہے، تضاد کا چلن ہے۔ اقلیت شاید ہی کسی اکثریت کا حصہ بن پاتی ہے۔ عمل اور ردعمل کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ کبھی اقلیت خوفزدہ رہتی ہے، کبھی اکثریت تمامتر طاقت کے باوجود اندر سے ہل جاتی ہے اور متزلزل ہونے کے بعد اس کا رویہ ردعمل کیطور پر انصاف پر مبنی نہیں رہتا۔ یہ نہیں کہ اکثریت انصاف کرنا یا دینا نہیں چاہتی بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ جیسے کسی کمرے میں ایک اچھلتا کودتا بندر آجائے، پھر گھر کے جملہ افراد کبھی بندر کو باہر نکالنے اور کبھی رام کرنے کے پلان بنانے لگیں۔ بندر غیر محفوظ ہو کر کبھی پنکھے پر چڑھے، کبھی خیں خیں کر کے گھر والوں پر لپکے، کبھی پردوں میں چھپ کر اپنی جان چھپائے، کبھی کرسی اٹھا کر آپ کی جان کا لاگو ہو۔ یہی حال اقلیت کا ہوا کرتا ہے۔ وہ یہ اچھل کود دراصل اپنی جان

بچانے کے لئے کیا کرتی ہے۔

جب اکثریت کا بہاؤ تیز ہو تو اقلیت کے خس و خاشاک بڑی تیزی سے بہتے ہیں، لیکن جب کبھی سامنے کوئی روک آجائے۔ درخت کا گرا ہوا تنا، لوہے کا جنگلا، ٹوٹا ہوا پل کوئی بھی رکاوٹ اس تیز بہاؤ کو سست کر دے تو پانی نچلی سطح پر تو رواں رہتا ہیں، لیکن روئے دریا پر جھاڑ جھنکار، پلاسٹک کے لفافے، ٹین ڈبے، بیکار اشیاء قعر دریا کی روانی کے ساتھ نہیں بہہ سکتیں اور رکنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ یہی وہ وقت ہے جب اقلیتی گروہ روٹھے بچوں کی طرح احتجاج پر آمادہ ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب اقلیت کے لئے مستعار مور پنکھوں کے ساتھ اپنی عزت نفس برقرار رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ اسے اپنے خام خیالوں کی دنیا سے نکل کر شعوری اور لاشعوری طور پر سوچنا پڑتا ہے کہ جو راستہ اس نے ترقی کی خاطر چنا، اس میں کیا کچھ کھویا اور کس قدر پایا۔ فلاح کا راستہ جو ترقی ہی کی شاہراہ ہے بہر طور پر کچھ اور تھا۔ اس کو چھوڑ کر اس کی زندگی کون سی سیڑھیاں اترتی چلی گئی، اسے آہستہ آہستہ پہ چلتا ہیکہ مذہب ک احکامات ہر صورت میں ہیومن رائٹرز سے بہتر تھے۔ دین الٰہی ہزار بار لبرل ہو اور وہ مہاراج ادھیراج اکبر کے سنگھاسن کو راجپوت اور مرہٹہ طاقت سے بچانے کے لئے اعلیٰ نسخے پر کوئی دین دار تا دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ ترقی کے لئے اپنی شناخت چھوڑی نہیں جا سکتی۔ مذہب کا پرچم اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ اب ایک بار پھر اقلیت رجعت کا سفر اختیار کرتی ہے۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا کہ سفر یہاں بھی لباس، زبان، رہن سہن، کلچر، وطنیت سے ہی شروع ہوتا ہے۔ ائد اعظم فرانس کے سلے سوٹ اتار کر اچکن شلوار اور جناح کیپ کو اختیار کرتے ہیں۔ افریقہ کا خوش پوش گاندھی دھوتی اور کھادی کی چادر کو اپنی شناخت بنا لیتا ہے۔ فرانس میں سکول کی لڑکیاں حجاب پہننے پر اصرار کرنے لگتی ہیں۔ امریکہ جیسے ملکم میں ایران کی عورتیں چادر عرب والیاں عبائیں اور پاکستانی خواتین کے سروں پر دوپٹے آجاتے ہیں۔

لباس کی یہ تبدیلیاں اس بار کسی اکثریت میں ضم ہونے کے بجائے اپنی شناخت کو علیحدہ رکھنے کیلئے کی جاتی ہے۔ایک مدت امریکی ماحول میں رہنے کے باعث اردو سینابلد بچوں کو اپنی زبانبولنے پر اکسایا جاتا ہے۔قرآن پڑھنے پر اصرار اور نماز روزے کی پابندی سکھائی جاتی ہے۔اپنے کلچر کی حفاظت ناگزیر لگتی ہے۔آخر میں اقلیت کو اپنے مسلک، اقدار، کلچر اور دین کیسوائے اپنی شناخت کا اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔جب اقلیتی گروہ اپنے آپ کو بچانے کی خاطر اکثریت سے کٹ کر عزت نفس کی خاطر مدافعت پر آمادہ ہوتا ہے تو یکدم اکثریت اس قدر خائف ہو جاتی ہے کہ پھر مسلمانوں کو خاص طور پر فنڈ امنٹلسٹ اور دہشت گرد کی مہذب گالی دی جاتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ جس قدر حیرت زدہ اقلیت امریکی بہاؤ میں ضم ہونے کی جلدی کرتی ہے۔اسی جذبے کے ساتھ ناراض اقلیت اپنی شناخت کو پانے کے لئے تیز رفتار، مضبوط اور باہمت ہو جاتی ہے اپنے وجود کی علیحدگی کا ثبوت بہم پہنچانے کے لئے کوئی چھوٹی سچھوٹی یا بڑی سے بڑی تبدیلی کافی نہیں ہوتی۔تحریکیں، احتجاج جلسے، Walks، پتھراؤ، خودکش دستے، ڈنڈے، کلاشنکوف سارے منفی اور مثبت اظہار بروئے کار لائے جاتے ہیں۔نہ تو پانی میں کود جانے کے وقت اقلیت کو انسانی حدود خیال آتا ہے، نہ ہی پانی سے باہر نکلتے وقت اپنی برہنگی کو تولئے میں لپیٹنے کا فن اس کے بس کی بات ہے۔

اقلیتوں کا مسئلہ وہاں شدید تر ہوتا ہے۔جہاں اکثریت امریکنوں کی طرح جسمانی ساخت اور رنگ کی بدولت سیاہ براؤن، چینی، جاپانی لوگوں کو اپنے میں ضم نہیں کر سکتی۔یہ مسئلہ ہندوستان میں بھی تکلیف دہ حد تک نا قابل حل تھا۔یہاں تقسیم مذہب کی بناء پر ہوئی، کیونکہ ساری سوسائٹی مذہبی اعتقادات کی بناء پر ویدوں کے زمانے سے مذہبی طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔برہمن جاتی شودروں کو دھرم کی بنا پر اپنے میں سمو نہیں سکتی تھی۔امریکہ میں رنگت کی تقسیم نے بنیادی مساوات قائم نہ ہونے دی۔

ہندوستانمیں مذہب یکجہتی کی فضاء پیدا کرنے میں مزاحم ہوا۔ نہ رنگت انسان کے بس میں ہے اور نہ ہی کوئی شودر اپنے آپ کو برہمن Declare کرنیکا اہل ہے۔ ہندوستان میں ساری اقلیتیں بالآخر اپنے اپنیگروہوں میں جکڑی گئیں۔ پارسی، اینگلو انڈین، سکھ اور مسلمان اس بات کے شاہد ہیں کہ ہندوستان میں ان کی شناخت بی کلاس سٹیزن کی رہی ہے۔

سکھوں اور مسلمانوں کی حالت ہندوستانمیں دوسری اقلیتوں سے مختلف تھی۔ وہ برصغیر میں بادشاہت کے مزے لوٹ چکے تھے۔ مغل بادشاہوں نے ذمیوں کے حقوق کا اس درجہ خیال رکھا تھا کہ راجپوت اور مرہٹے مغل راج میں بڑی طاقتیں بن گئے۔ مسلمان کسی اقلیت کو جبراً اپنے میں ضم کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اقلیت کی حفاظت کے لئے ضرور جزیہ کی شکل میں ٹیکس لگایا جاتا رہا، لیکن جذبہ اقلیت کی حفاظت کے لئے اکٹھا کیا جاتا تھا۔ سکھوں نیہندوؤں میں ضم ہونے کی خاطر ہندوؤں میں شادیاں تک کیں۔ توحید پرست ہونے کے باوجود گورو نانک جی کی تصویروں، بتوں کو ماتھا ٹیکا اور رسومات میں ہندوؤں کی پیروی کی، لیکن مسئلہ ان کا بھی حل نہ ہو سکا۔ بابری مسجد کا منہدم ہونا اور امرتسر کے گردوارے کی بے حرمتی اس بات کی شاہد ہے کہ ابھی تک ہندو جاتی کا غصہ فرو نہیں ہوا۔ حیلہ جوئی یا زبردستی سے کسی فرد یا گروہ کو اپنے میں ضم کرنے کی کوشش اسلام کے لئے ایک مذموم فعل ہے۔ استقامت سے مثالی زندگی پیش کرتے رہنا سب سے زیادہ محیر العقول معجزہ ہے، جس کے سحر سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ یہی راستھصوفیا کا رہا جس سیہندوستان کے اکثریتی لوگ اسلام میں ضم ہوئے۔

افسوس کہ سفید فام امریکی ایسا کوئی حل پیش نہ کر سکا، کیونکہ وہ کسی ایسے اقلیتی گروہ کو اپنے میں ضم کرنا ہی نہ چاہتا تھا جو اس سے مختلف تھا۔ وہاں صرف Human Rights کا نعرہ بلند ہوا جس نے جمہوری نظام کو تو مضبوط کیا، لیکن فرد کے احساس شکست کو کم نہ کر سکا۔ امریکہ میں کرسچن بلٹ میں بسنے والے لوگوں کا خیال ہے کہ

امریکہ کے زوال کی وجہ نیگرو اور ریڈ انڈین کی بد دعا ہے جو نسل در نسل ان کے دلوں سے نکلتی ہے اور جس کے باعث امریکی سوسائٹی سطح پر پر امن، لیکن اندر سے بپھرتی چلی جاتی ہے۔ میں اپنی لہر در لہر بار بار لوٹ آنے والی سوچ میں یہاں تک پہنچا تھا کہ ایک بار پھر ارجمند کی آوازیں شروع ہو گئیں۔ میری زندگی میں بلاوے کم ہیں، اس لئے میں ان پر لبیک کہتا ہوں۔

میں اس نیگرو کا نام سمجھ نہیں پایا۔ کیونکہ اس کے تلفظ میں ڈبلیو اور زیڈ کی بڑی زیادتی ہے اور وہ عجب طرح سے حروف کو مخفف کرنے کا بھی عادی ہے، پھر اس کا لب و لہجہ عام امریکن زبان سے مختلف ہے۔ میں اسے انکل ریمس بلاتا ہوں اور وہ خوش دلی سے اس نام پر جواب دیتا ہے۔ سپر مارکیٹ میں وال مارٹ سے کچھ آگے باڈر بک شاپ ہے، جہاں بارڈھیروں کتابیں قارئین کے مطالعے کے لئے پڑی رہتی ہیں۔ اسی جگہ ایک پلاسٹک کی کرسی پر کبھی کبھی انکل ریمس مجھے بیٹھا نظر آتا ہے۔ اس کی بیٹی یا بہو گروسریز کرنے جاتی ہے اور وہ یہاں بیٹھ کر کبھی کبھی کاغذی گلاس میں کافی پیتا نظر آتا ہے۔

اس روز وہ سیاہ مجسمہ مجھے دیکھ کر مسکرایا، میں اس کے قریب ہو گیا۔

''گڈ مارننگ'' انکل ریمس بولا۔

''گڈ مارننگ انکل ریمس۔ کیا آپ کافی پینا پسند کریں گے''۔

''آئی ڈونما ئنڈ بڈی.....ون مور کپ''۔

ہم دونوں کافی شاپ کے سامنے لگی گول میزوں کی طرف چل دیئے۔ جب ہم قریب پہنچے تو ایک لمبی دم والی کالی کوئل ہمارے قریب ہی میز پر بیٹھ گئی۔ انکل ریمس نے کہا۔

''گاڈ ایسے چاہتا تھا.....''

''کیا چاہتا تھا؟.....''